اشرف صبوحی
(۱۹۰۵ء-۱۹۹۰ء)

اشرف صبوحی کا اصل نام سیّد ولی اشرف اور قلمی نام اشرف صبوحی تھا۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں اینگلو عربیک ہائی سکول دہلی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ معروف ادیب شاہد احمد دہلوی ان کے ہم جماعت تھے۔ اشرف صبوحی محکمہ ڈاک و تار میں ملازم رہے۔ بعد میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آ گئے۔ ۱۹۶۵ء میں ملازمت سے سَبُک دوش ہوگئے اور ہمدرد دواخانہ کے شعبہ مطبوعات سے وابستگی اختیار کر لی۔

اشرف صبوحی ایک صاحبِ طرز ادیب تھے۔ اردو زبان خصوصاً دہلی کے مختلف طبقوں کی بول چال اور وہاں کے روزمرہ اور محاورے پر پوری گرفت رکھتے تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیوں کی درجن بھر کتابیں بھی لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

ان کی تصانیف میں دِلّی کی چند عجیب ہستیاں، غبارِ کارواں، جھروکے، سلمٰی اور بن باسی دیوی شامل ہیں۔ اشرف صبوحی نے چند انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ بھی کیا۔

پرستان کی شہزادی

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ کو اردو کی معروف داستانوں اور اُن کے مصنّفین سے رُوشناس کرانا۔
۲۔ دہلی کے روزمرّہ اور محاوروں سے مُزیّن ایک نثر پارے کے ذریعے سے طلبہ کی لسانی صلاحیت میں اضافہ کرنا۔
۳۔ اشرف صبوحی کے دل کش اسلوب سے آگاہ کرنا۔
۴۔ طلبہ کو ذُو معنی الفاظ اور تشبیہ سے روشناس کرنا۔

سیّدانی بی کا ایک وقت میں بڑا دور دورہ تھا۔ قلعے کی اچھی اچھی مُغلانیاں ان کے سامنے کان پکڑتی تھیں۔ محلّات میں جہاں کوئی نیا جوڑا سِلا، کسی نئی وضع کی ٹِکائی کا ذکر ہوا اور یہ بلائی گئیں۔ شہر کی بیگمات میں بھی ان کے ہُنر کی دھاک تھی۔ سب انھیں آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ آج پالکی چلی آ رہی ہے کہ بڑی سرکار نے بلایا ہے۔ کل ڈولی کھڑی ہوئی ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے یاد کیا ہے۔ نہ رات کو فُرصت تھی نہ دن کو چین۔ صبح کہیں مہمان ہیں تو شام کو کہیں، لیکن رہے نام سائیں کا۔ بڑھاپا آیا، تو ہاتھ پاؤں نے جواب دے دیا۔ آنکھیں دھندلا گئیں۔ اب کون پوچھتا؟ دنیا اور مطلب۔ مطلب نہ رہا، تو کیسی خاطر داری؟ ہارے وقت کا کوئی ساتھی نہیں۔ بے چاری کو ٹکڑے کا سہارا دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ جب بہت پریشان ہوئیں تو پڑوس میں ایک میر صاحب رہتے تھے، ان کی بیوی نے انھیں ترس کھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔

سنا ہے کہ یہ نہایت شریف گھرانے کی بیٹی تھیں۔ مرہٹہ گردی میں ان کا خاندان تباہ ہو گیا۔ برس دن کی بیاہی بیوہ ہو گئیں۔ اس زمانے میں دوسری شادی کرنا بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔ مُغلانی کا پیشہ اختیار کر لیا اور اپنی ہنرمندی کی بدولت رنڈاپا گزار دیا۔ جوانی تو عزّت آبرو سے کٹ گئی، خوب کمایا، ہزاروں روپے اِنعام میں لیے، مگر رکھنا نہ جانا۔ دل کی حاتم اور طبیعت کی نرم تھیں اور پرانے شریفوں میں ایک یہی عیب ہوتا ہے کہ وہ وقت کی قدر نہیں کرتے۔ خدا کی بے نیازی کو بھول جاتے ہیں۔ بنے ہوئے زمانے میں بگڑنے کا خیال بھی نہیں آتا۔ جانتے ہیں کہ یہی لہر بہر رہے گی۔ سیّدانی بی بھی جوانی بھر اس غلط فہمی کا شکار رہیں۔ بُڑھاپے نے آن دبایا۔ طاقتیں دغا دے گئیں، تو آنکھیں کُھلیں اور دوسروں کے سہارے پر زندگی کے اندھیرے دن پُورے کرنے پڑے۔

میر صاحب کے گھر والے چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب کے سب انتہا سے زیادہ خوش مزاج اور خدا ترس تھے۔ ہر ایک سیّدانی بی کو خدا کا بھیجا ہوا مہمان سمجھ کر ان کے سامنے بچھا جاتا تھا۔ سیّدانی بی دو چار دن تو ذرا غمگین اور شرمندہ شرمندہ سی رہیں،

پھران کا بھی دل کھل گیا اوراس طرح رہنے لگیں جیسے اپنے کنبے میں۔ ہاتھ کانپتے تھے، نگاہ موٹی ہوگئی تھی، سُوئی کا نا کا مشکل سے سوجھتا تھا لیکن ساری عمر محنت کر کے کھایا تھا۔ پرائی روٹی مفت کیسے کھا سکتی تھیں؟ صبح نماز پڑھ کر بچوں کو لے بیٹھتیں۔ قرآن شریف پڑھاتیں، نصیحتیں کیا کرتیں۔ دوپہر کو سینا، پرونا اور کاڑھنا سکھاتیں۔ شام ہوتی تو باورچی خانے میں جا کر کھانا پکانے کی ترکیبیں بتاتیں۔ عشا کی نماز سے فارغ ہوکر بڑے مزے کی کہانیاں سناتیں۔ کہانیاں ایسی اچھی ہوتیں کہ بڑے بھی آجاتے۔ میر صاحب اوران کی بیوی، دونوں خوش تھے کہ سیّدانی بی کو بچوں کی تربیت کے لیے خدا نے بھیج دیا۔ ایسی شریف، نماز روزہ کی پابند، ہنرمند استانی صرف روٹیوں پر کہاں میسر آتی ہے؟ بچے ایسے گرویدہ ہوئے کہ دن رات سیّدانی بی کے پاس بیٹھے رہتے۔

مشہور تھا کہ سیّدانی بی پرستان میں بھی ہوآئی ہیں۔ وہاں کے بادشاہ نے انھیں اپنی بیٹی کا جہیز ٹانکنے کے لیے بلایا تھا اور انھوں نے وہاں کئی دن رہ کر بڑے بڑے تماشے دیکھے ہیں۔ گھر والوں کو یہ خبر تھی، لیکن کبھی خیال نہیں آیا کہ سیّدانی بی سے پوچھتے تو، کیابی، سچ مُچ تم پرستان گئی ہو؟ شاباش! تمھارا جگرا، تم کو ڈر نہیں لگا؟

ایک دن سردیوں کی رات تھی۔ دالانوں کے پردے پڑے ہوئے تھے، چھوٹے بچے لحافوں میں دُبکے اور بڑے لڑکے، لڑکیاں انگیٹھی کے چاروں طرف بیٹھے کہانی سن رہے تھے، اتنے میں میر صاحب کی بیوی نماز وظیفے سے فارغ ہوکر آئیں۔ اتفاق سے کہانی بھی انڈا شہزادی کی تھی۔ جب یہ ذکر آیا کہ کانڑے دیو کی جو شہزادی پر نظر پڑی تو سوتی کو پلنگ سمیت اُڑا کر لے گیا، کہنے لگیں: ''سیّدانی بی! یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تمھیں بھی پرستان کے بادشاہ کا کوئی آدمی پرستان لے گیا تھا اور تم وہاں سے بڑا اِنعام واکرام لائی تھیں، کیا یہ سچ ہے؟''

سیّدانی: ''ہاں بیوی، ہے تو سچ، بلکہ کئی دفعہ جنوں اور پریوں نے مجھے بلایا ہے۔''

میر صاحب کی بیوی: ''اُوئی! اور تم بے دھڑک چلی گئیں؟''

سیّدانی: ''پہلی دفعہ تو مجھے دھوکے سے لے گئے تھے۔ راستے میں جب بھید کھلا تو بہتیری ڈری، لیکن کیا کرتی، دل کو مضبوط کرلیا۔ اللہ کو یاد کرتی ہوئی چلی گئی۔ نہ جاتی یا روتی پیٹتی تو جانے کیا آفت آتی۔ اس کے بعد جب گئی، ہنسی خوشی گئی اور ہنسی خوشی آئی۔ بیگم! صدقے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے، اس پر ایمان رکھنے والے کا کہیں بال بیکا نہیں ہوا۔ پرستان میں بھی میری وہ خاطریں ہوئیں کہ کیا کہوں۔''

میر صاحب کی بیوی: ''کچھ بھی سہی بوا۔ میرا تو پِتّا پھٹ جاتا۔ صورت دیکھتے ہی جان نکل جاتی۔''

سیّدانی: ''نہیں بی۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ڈر کی باتوں سے ڈر لگا کرتا ہے۔ جہاں ڈر سامنے آیا پھر کچھ بھی نہیں۔ دیکھو، بیماری سے لوگ کتنا بھاگتے ہیں اور جب بڑے سے بڑا دکھ بھی آجاتا ہے تو سہنا ہی پڑتا ہے۔''

میر صاحب کی بیوی: ''مَیں تو پھر کہوں گی کہ تم کو شاباش ہے۔ صدرحمت اس پر جس نے تمھیں دودھ پلایا۔ اچھا ہمیں بھی

تو سناؤ کہ کیا ہوا تھا۔ کیوں گئی تھیں؟ پرستان کیسا ملک ہے؟ وہاں کیا کیا دیکھا؟''

سیّدانی: ''وہ قصہ یاد آتا ہے، تو کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ پرستان کی شہزادی جس کے جوڑے ٹانکنے گئی تھی، بہت سر ہوئی۔ دوسری پریوں نے بھی منتیں کیں کہ سیّدانی اماں، یہیں رہ جاؤ۔ دنیا میں اب تمھارا کون ہے؟ مگر مَیں نے ایک نہ مانی۔ مجھ بدنصیب کو تو اپنے جیسے انسانوں کی بے مُروّتیاں دیکھنی تھیں، پرستان میں کیوں بستی؟ وہ تو اللہ نے تمھارے دل میں رحم ڈال دیا جو گور گڑھے کا ٹھکانا ہو گیا، ورنہ تیرے میرے دروں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔''

میر صاحب کی بیوی: ''سیّدانی بی! سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بندے میں کیا طاقت ہے کہ بھوکے کو دے یا پیٹ بھرے سے چھینے؟ ہر ایک اپنی تقدیر کا کھاتا ہے۔ ہماری کیا اصل کہ کسی کے ساتھ سلوک کریں۔ وہ زبردستی ہم سے تمھاری خدمت کرا رہا ہے۔''

سیّدانی: ''خیر، اب تم کو اپنی بیتی کہانی سناؤں۔ بیگم یہ وہ دن تھے کہ نواب اعظم الدّولہ بہادر کی اکلوتی بیٹی کے بیاہ کی تیاری ہو رہی تھی۔ مارا مار جوڑے سِل رہے تھے۔ اوّل اوّل تو مجھے رات دن وہیں رہنا پڑا۔ کام ہلکا ہو گیا تو دن کو چلی جاتی اور شام کو اپنے گھر چلی آتی۔ ایک روز جیسے بچے مکتب سے بھاگتے ہیں، میرا بھی جانے کو جی نہیں چاہا اور کئی جگہ سے بُلاوے آئے، نہ گئی۔ شاید جمعہ تھا۔ کتنے ہی دن نہائے کو ہو گئے تھے۔ خوب نہائی، شام ہو گئی۔ بونٹ پلاؤ مجھے خوب بھاتا ہے۔ ماما سے بونٹ پلاؤ پکوایا۔ تھکی تھکائی لیٹی تھی۔ اتنے میں جُھٹ پٹا ہو گیا۔ پلاؤ دم پر تھا کہ باہر سے کسی نے آواز دی: ''سیّدانی بی کو سرکار نے یاد کیا ہے۔ پینس بھیجی ہے، جس طرح بیٹھی ہو، اسی طرح فوراً چلی آؤ۔''

مَیں بڑے نخروں سے جایا کرتی تھی۔ ایسے بے وقت اور اپنے بھاؤن کی پکوائی ہوئی چیز چھوڑ کر کھڑے ہو جانا میری عادت کے بالکل خلاف تھا، لیکن ہونے والی بات، مَیں نے ذرا انکار نہ کیا اور جیسی بیٹھی تھی، سفید چادر سر پر ڈال، سوار ہو گئی۔

نواب صاحب کا محل میرے گھر سے کوئی دو آنے ڈولی ہو گا۔ قاضی واڑے سے نکلے اور خانم کا بازار آیا۔ پہلے تو مجھے کچھ خیال نہ ہوا۔ جب بہت دیر ہو گئی اور ہٹو بچو کی آواز نہ آئی، بازار کے چراغ بھی جھلکتے ہوئے دکھائی نہ دیے، تو پردے کی جھری کھولی۔ اب جو دیکھتی ہوں، تو جنگل سائیں سائیں کر رہا ہے اور پینس کو جیسے پہیے لگے ہوئے ہیں، اُڑی چلی جا رہی ہے۔ کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ بدن میں سنسنیاں آنے لگیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے کہ یہ کیا غضب ہوا۔ یہ موئے کہار کہاں لیے جاتے ہیں؟ اس جنگل میں کون سی سرکار ہے؟ لیکن مرتا کیا نہ کرتا، دل کڑا کر کے مَیں نے اپنی آواز نکالی اور پوچھا: ''اے کم بختو! منہ سے تو پھوٹو، مجھے کہاں لے جاؤ گے؟ ارے وہ تمھاری کون سی ستیاناسی سرکار ہے؟''

ہنستے ہوئے کسی نے جواب دیا: ''سیّدانی بی، خفا کیوں ہوتی ہو۔ بادشاہ سلامت نے بلایا ہے، کوئی دم میں محلّات دکھائی دیتے ہیں۔''

ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی پالکی کے پاس بول رہا ہے۔ منہ نکال کر جو دیکھا تو بیگم کیا کہوں، ایک بے چا کی شکل کا آدمی تھا۔ بکرے کا سا منہ، گھوڑے کی سی ٹانگیں اور پالکی آپ ہی آپ چلی جاتی تھی۔ نہ کہار تھے نہ کہاریاں۔ اب تو ڈر کے مارے میرا دم گھٹنے لگا۔ آنکھیں بند کر لیں اور کلمہ پڑھنے لگی۔ ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ منٹ دو منٹ کے بعد پھر ہمّت کی کہ اوّل مرنا، آخر مرنا پھر مرنے سے کیا ڈرنا اور للکار کر بولی: ''ارے جواں مرگ، تو کون ہے جن یا بُھوت؟ یا درکھ مَیں سیّدانی ہوں۔ مجھ کو بتا، نہیں تو جل کر راکھ ہو جائے گا۔ بھلا چاہتا ہے تو مجھے یہیں اُتار دے۔''

اس نے کہا: ''سیّدانی بی! گھبراؤ نہیں۔ ہم اور ہمارا بادشاہ سیّدوں کو بہت مانتے ہیں۔ خاطر جمع رکھو، کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہماری شہزادی کی شادی ہے۔ کپڑے سی کر چلی آنا۔ جتنا مانگو گی، اِنعام ملے گا۔ لو دیکھو، وہ سامنے ہمارے بادشاہ کا محل ہے۔''

بڑی مشکل سے ڈرتے ڈرتے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، تو واقعی پالکی ایک عالی شان دروازے پر رکھی تھی۔ روشنی ایسی تھی کہ دن معلوم ہوتا تھا۔ سُوئی، گر پڑے، تو اُٹھا لو اور مزہ یہ کہ سورج تھا نہ چاند، نہ فانوس کہیں نظر آتے تھے نہ لالٹین۔ چوب دار، باری دار مرد ہیں، اِدھر کے اُدھر، اُدھر کے اِدھر دوڑ رہے تھے۔ آسمان پر سے عجب عجب طرح کے باجوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ تماشا دیکھ کر مَیں ساری مصیبت بھول گئی۔ مَیں حیران تھی کہ یہ کس بادشاہ کا محل ہے؟ یہ گہما گہمی تو ہمارے بادشاہ کے ہاں بھی نہیں ہوتی۔ قصّے کہانیوں میں جیسی پریوں کا ذکر سنا ہے، ایسی ایک پری، شانوں پر بال بکھرے ہوئے، بازوؤں پر پَر، میرے پاس آئی اور مہین آواز میں بولی: ''سیّدانی بی، بڑی راہ دکھائی۔ ہمارے بادشاہ اور بادشاہ بیگم کب سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ آؤ چلو مَیں تم کو محل کے اندر لے چلوں۔''

مَیں پالکی سے اتری اور چادر کو اچھی طرح اَوڑھ اس پری کے ساتھ ساتھ چلی۔ کیا کہوں، اندر کیا بہار تھی۔ ہزاروں پریاں گورے گورے رنگ، بُوٹا سا قد، زرق برق کپڑے، ہنستی، چُہلیں کرتی اَہلی گہلی پھر رہی تھیں۔ چمن ایسا کہ نہ دیکھا نہ سنا۔ ہر درخت کا تنا چاندی کا، سونے کی شاخیں زُمُرّد کے پتّے، پھلوں کی جگہ کہیں لعل لٹک رہے تھے، کہیں نیلم، کہیں پکھراج۔ پھولوں پر یہ عالَم تھا جیسے ہیرے چمک رہے ہوں۔ کلیاں تھیں کہ صُراحی دار موتی۔ خوش بُو سے دماغ مہکا جاتا تھا۔ حوضوں کا پانی اللّٰہ اللّٰہ! چاندی کے وَرق بکھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ فوّاروں میں سے موتیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

چلتے چلتے ایک بارہ دری میں پہنچے۔ بارہ دری کی سجاوٹ کیا بیان کروں۔ قلعے کے دربار بھی دیکھے ہیں، مگر اُس جیسا سماں آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ سیکڑوں سرخ، سبز، نیلی، زرد، اُودی، سفید کرسیاں بچھی تھیں۔ رنگ برنگ کے بلور کی تھیں یا کسی اور چیز کی، ایسی شفاف کہ آر پار نگاہ گزر جاتی تھی اور اُن پر حسین حسین پری زاد جگمگاتے لباس پہنے بڑے ٹُھسّے سے بیٹھے تھے۔ بیچ میں ایک نمگیرے کے نیچے ایک بڑے یاقوت کے تخت پر، جس میں ہیرے اور پنّے کی پچی کاری کا کام تھا، بادشاہ اور بادشاہ بیگم عجیب شان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہ بیگم کے پہلو میں ایک لڑکی کوئی چودہ پندرہ برس کی، چہرہ جیسے چودھویں رات کا چاند، زُلفیں کھلی ہوئی،

کئی رنگ کے پَر اور ایسے چمک دار کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی، سر پر نیم تاج رکھے بیٹھی تھی اور تینوں کی پوشاکیں ایک رنگ کی ہوں، تو بتاؤں۔ گھڑی میں چار چار رنگ بدلتی تھیں۔

مَیں آگے تو بڑھ رہی تھی، مگر ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ڈر سے نہیں، حیرانی سے کہ یا اللّٰہ، یہ کون لوگ ہیں! مَیں جاگ رہی ہوں یا خواب میں یہ پرستان کی سیر ہے، اور اگر جاگتے میں کوئی پری یا دیو مجھے یہاں اُڑا لایا ہے، تو دیکھیے گھر اُلٹا جانا بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ اسی سوچ میں تخت کے پاس پہنچ گئی۔ بادشاہ میری گھبراہٹ دیکھ کر مسکرائے اور بادشاہ بیگم نے مجھ سے کہا: ''آؤ! سیّدانی بی آؤ! مزاج تو اچھا ہے؟ مَیں نے سنا ہے کہ راستے میں تم بہت ڈریں۔''

مَیں بولی: ''حضور کو دعا دیتی ہوں اور حضور ڈرنا کیسا۔ وہ تو اللّٰہ تعالیٰ نے مدد کی۔ نہیں تو جان نکلنے میں کسر ہی کیا رہی تھی۔'' صدقے مولا کے نام پر۔ بادشاہ اور سارے درباری سروقد کھڑے ہو گئے اور بادشاہ فرمانے لگے: ''سیّدانی بی! تم جانتی ہو، ہمارے ہاں اس نام کی کتنی عزّت ہے۔''

مَیں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ جو کچھ بھی ہو، یہ لوگ ہیں مسلمان اور اب کسی بات کا ڈر نہیں۔

بادشاہ بیگم: ''ہم کو گنہگار نہ کرو، ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولیں: بیٹھ جاؤ۔ ہاں تم ڈری کیوں تھیں؟''

مَیں نے کہا: ''سرکار، ڈرنے کی بات کیوں نہ تھی؟ ایک اکیلی، دوسرے سُنسان جنگل، پھر جو میرے ساتھ تھا، اس کی صورت ایسی ڈراؤنی تھی کہ میرے اوسان جاتے رہے۔''

یہ سن کر شہزادی خوب ہنسی اور بولی: ''اماں بیگم، بکر گدھا مُوا بڑا شریر ہے۔ اس نے کہیں اپنی شکل دکھا دی ہوگی۔'' اب میرے پیٹ میں پھر ہول اٹھنے لگے کہ کہیں یہ ساری صورتیں بھی نقلی نہ ہوں اور بَولا بَولا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

بادشاہ بیگم سمجھ گئیں کہ شہزادی کی باتوں سے سیّدانی کے دل میں ہماری صورتوں کی طرف سے کچھ شُبہ ہو گیا ہے۔ وہ مسکرا کر بولیں:

''سیّدانی بی! ڈرو نہیں، ہماری سب کی شکلیں اصلی ہیں، بلکہ پری زادوں کی ساری ایسی ہی خوب صورت شکلیں ہیں جیسی تم دیکھ رہی ہو۔ میری لڑکی سہیل پری نے جس کا ذکر کیا، وہ جن ہے اور جن البتہ وضع وضع کی شکلوں کے ہوتے ہیں۔ خاطر جمع رکھو، تمھارے سامنے کوئی جن یا دیو بُری صورت بنا کر نہیں آئے گا۔''

اتنے میں کھانوں کے خوان اُترنے لگے۔ خاصہ چُنا گیا۔ کھانا کیا تھا، اللّٰہ کی قدرت کا کرشمہ۔ ایک ایک بالشت کے پودے پھلوں، پھولوں سے لدے ہوئے سامنے تھے۔ خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں، مگر مَیں کھاتی کیا؟ نہ کسی قسم کی روٹی تھی نہ سالن، نہ پلاؤ تھا نہ زردہ۔ ہکّا بکّا ایک ایک کا منہ دیکھ رہی تھی کہ بادشاہ بیگم مسکرا کر بولیں: ''سیّدانی بی! دیکھتی کیا ہو، کھاتی کیوں نہیں؟ یہ پرستان کا کھانا ہے۔ تم مہمان ہو، ہاتھ بڑھاؤ تو اور بھی کھائیں۔'' مَیں نے کہا: ''سرکار کوئی کھانے کی چیز ہو تو کھاؤں، یہ تو نگوڑے

درخت ہیں اوران میں جو پھل پُھول لگے ہیں، وہ بھی اللہ مارے سچ مچ کے نہیں دکھائی دیتے۔'' شہزادی الھڑ نے میرے اس کہنے پر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور کہنے لگی: ''سیّدانی بی! جیسا سُنا تھا کہ آدم زاد بڑا بھولا ہوتا ہے، تمھیں ویسا ہی پایا۔ تم بسمِ اللہ کر کے کوئی پھل توڑ واور کھاؤ تو جس کھانے کا دل میں خیال کروگی، وہی مزہ آئے گا۔''

''بیگم یقین مانو ایک زردزرد جو پھل توڑ کر مَیں نے منہ میں رکھا، کیا کہوں دِلّی میں تو کسی نے ایسے ذائقے کا بونٹ پلاؤ کھایا نہ ہوگا۔''

میر صاحب کی بیوی: ''بونٹ پلاؤ جو گھر میں چھوڑ کر گئی تھیں وہی پہلے یاد آیا۔''

بڑی لڑکی: ''قلعے میں تو آپ بہت جایا کرتی ہیں۔ کیا وہاں بھی کبھی ایسے مزے کا پلاؤ نہیں کھایا؟''

سیّدانی: ''حسینی بادشاہ کے خاص رکاب دار کے ہاتھ کے بڑے بڑے تعریفی کھانے بیسیوں مرتبہ کھائے ہوں گے، مگر بیوی! وہ بُو باس، وہ آب ونمک ہی کچھ اور تھا۔ ہاں تو بہن، بس پھر کیا تھا، جو جو کھانے کھائے تھے بلکہ جن کا نام ہی سنا تھا، ان کا خیال کرتی گئی اور اللہ تیری شان، وہی مزہ آتا گیا۔ اچنبھے کی بات تھی کہ جب ایک پھل توڑتی، دوسرا اس کی جگہ فوراً نکل آتا۔ پھولوں، کلیوں کو جو چکھا، مٹھائیاں تھیں۔ ایسی ایسی نفیس، ہلکی خوش ذائقہ کہ ہر نوالے میں روح تازہ ہوتی چلی گئی۔ پیاس معلوم ہوئی، تو پانی کا خیال آتے ہی یاقوت کا گلاس خود بخود آکر منہ سے لگ گیا۔ یاقوت کا گلاس اور ایسا حباب کا کہ باہر سے پانی جھم جھم کرتا دکھائی دیتا تھا۔ ڈر کے مارے مَیں نے زور سے ہونٹ بھی نہیں بھینچے کہ کہیں کنارہ ٹوٹ کر منہ میں نہ چُبھ جائے۔ اللہ اللہ! پانی کو نہ پوچھو، ایسا میٹھا، ایسا مُعطّر، ایسا سفید، پانی تو نہیں ہوتا۔ نہ جانے کیا چیز تھی۔ سب کے بعد مَیں نے سوچا کہ پتّوں کو بھی دیکھنا چاہیے۔

ساتھ ہی پان کا بھی خیال آیا۔ مَیں پان آج بھی بہت کم کھاتی ہوں، لیکن کھانا کھا کر دو وقت تو ضرور کھانے کی عادت ہے۔ اب جو پتّا توڑتی ہوں، تو پان کی خوش بُو، مُنھ میں جو رکھا، تو یہ معلوم ہوا کہ عطردان میں رکھی ہوئی گلوری کلّے میں آگئی۔ کہتے ہیں کہ محمد شاہ رنگیلے کی کوکلا بائی جیسا پان کھاتی تھی، لال قلعے میں تو اس سے پہلے، نہ اس کے بعد کسی کو نصیب ہوا، مگر مَیں کہتی ہوں کہ اگر وہ پرستان کے اس پتّے کو ایک دفعہ صرف سونگھ لیتی، تو ساری عمر سر دُھنتی رہتی۔ مُشک وعنبر پڑے ہوئے کتھے اور سچّے موتیوں کے چُونے کا پان بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے۔ جب سانس لیتی تھی، نئی سے نئی خوش بو کی لپٹیں آتی تھیں۔

اب بہن! بادشاہ بیگم نے جن کا نام زُمرّد پری تھا، توشہ خانے والیوں کو حکم دیا کہ شہزادی کے کپڑے لاؤ۔ کشتیوں پر کشتیاں، تھان پہ تھان آنے لگے۔ کپڑوں اور گوٹا کناری کو دیکھ کر میری تو عقل جاتی رہی۔ بڑی بڑی رانیوں، شہزادیوں کے جوڑے دیکھے ہیں، نور بائی کی پشواز بھی دیکھی ہے جس میں سیروں جواہرات ٹکے ہوئے تھے، لیکن اُن کپڑوں سے کیا نسبت۔ کُجا دُنیا کے کپڑے، کُجا پرستان کے۔ آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ریشم اور سونے کے تاروں سے بنی ہوئی آبِ رواں، موتیوں سے لیسی ہوئی گلشن۔ ایسا ہی کم خواب اور زربفت کہ دیدہ نہ شُنید۔ گوٹا وہ کہ دنیا دیکھے اور اَش اَش کرے۔ رنگ رنگ کے جواہرات کی لڑیاں تھیں۔ جب

سامان آ گیا، تو بادشاہ بیگم بولی: ''لو، بی سیّدانی، اب تم اپنا ہنر دکھاؤ۔ بہت تمھاری تعریف سنی ہے۔ ہم تو جب جانیں کہ پرستان میں بھی تمھارا نام ہو جائے۔'' مَیں دل میں تو بہت پریشان ہوئی کہ یااللّٰہ مَیں یہاں کیا کاری گری دکھاؤں گی۔ کون سی وضع ٹانکوں کہ ان کے لیے نئی ہو، مگر زبان سے کہا: ''حُضور! اللّٰہ مالک ہے۔ وہی آبرو رکھنے والا ہے۔ صُبح ہونے دیجیے، جو کچھ مجھے آتا ہے، حاضر ہوں۔'' وہ ہنس کر بولی: ''سیّدانی بی، پرستان میں نہ دن ہوتا ہے نہ رات۔ ایک ہی موسم اور ایک ہی وقت رہتا ہے۔ تم جب چاہو کام شُروع کر دو۔'' مَیں نے تعجُّب سے عرض کیا: ''تو کیا یہاں لوگ سوتے نہیں؟'' کہنے لگی: ''یہاں سونے کا کیا کام، نیند پرستان میں نہیں آتی۔ ہمارا مشغلہ تو آٹھوں پہر سیر سپاٹے ہیں۔ پرستان سے جی اُکتایا تو دُنیا والوں کے خوابوں میں چلے گئے۔''

بہن مَیں نے دیکھا کہ واقعی نیند کا نام بھی آنکھوں میں نہیں۔ نہ پیٹ میں گرانی نہ سر بھاری، نہ انگڑائیاں، نہ جمائیاں۔ سوچا کہ دیر کیوں لگائی جائے۔ کترِ بیونت کا سامان تو موجود ہی تھا۔ اللّٰہ کا نام لے کر جوڑے کترنے لگی اور اسی وقت سے سینے اور ٹانکنے کا لگا دیا۔ ادھر مَیں ایک طرف بیٹھی ہوئی اپنے کام میں مصروف تھی۔ اُدھر ناچنے گانے والی پریوں کے تخت اُتر رہے تھے۔ ایک سے ایک طرح دار، ایک سے ایک شوخ، اپنے فن میں اُستاد، نہ کانوں نے کبھی ایسا گانا سنا تھا، نہ آنکھوں نے ایسے ناچ دیکھے تھے۔ آوازیں تھیں کہ جیسے کوئلیں مل کر کوکیں، ناچ تھا کہ ہوا میں جیسے تتلیاں اُڑ رہی تھیں۔ کیا پوچھتی ہو بیگم! خدا کی قدرت کا تماشا تھا، لیکن مجھے تو اپنی فکر تھی کہ کہیں جلدی کام نپٹے اور چھٹکارا پا کر گھر جاؤں۔ ذرا کی ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھ لیتی اور اپنی سوئی چلانے لگتی۔

اُس کی کارسازی کے قربان، صدقے مشکل کُشا کے، عقل نے ایسا کام دیا اور پہلے ہی جوڑے میں واہ وا ہو گئی۔ شہزادی کا چہرہ بھی خوشی کے مارے پھول کی طرح کِھل گیا۔ اب کیا تھا میرے ہاتھ پاؤں میں گھوڑے لگ گئے۔ دنوں کا کام گھڑیوں میں ہونے لگا۔ کہانی بہت لمبی ہے، کہاں تک کہوں جس کام کی آدمی دُھن باندھ لے، وہ ہو ہی جاتا ہے۔ آخر سارے جوڑے سِل بھی گئے اور ٹِک بھی گئے۔ کتنے دن لگے؟ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ وہاں دنوں کا حساب ہی نہ تھا۔ ہاں اگر یہاں اتنا کام کرتی، تو خدا جھوٹ نہ بلوائے، میرے اکیلے ہاتھ پر ایک سال سے کم نہ لگتا۔ اس عرصے میں ساری پریاں خاص طور پر شہزادی مجھ سے بہت محبت کرنے لگی تھی۔ ''خالہ سیّدانی''، ''خالہ سیّدانی'' کہتے کہتے اس کا منہ سوکھتا تھا۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی اور مجھ کو سوئی چلاتے دیکھا کرتی۔ تم جانو، پاس رہنے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ مجھے بھی اُس کی بھولی بھالی شکل پر پیار آتا تھا، مگر دل کو کیا کرتی یہ نگوڑا تو یہاں پڑا ہوا تھا۔ گھر کی یاد چین نہیں لینے دیتی تھی۔ ہائے اپنا کھنڈلا پرستان میں بھی نہیں بھولا۔

آخر جب سارا کام اُن کی مرضی کے مطابق ہو گیا، تو مَیں نے کہا: ''حضور! خدا نے مجھے سُرخ رُو کیا۔ مولا نے میری آبرو رکھ لی۔ سرکار کی شہزادی کی شادی اور شہزادی کو یہ جوڑے پہننے مبارک ہوں۔ اب لَونڈی کو رُخصت کیجیے۔'' بادشاہ بیگم بولی: ''سیّدانی بی، ہمارا جی چاہتا ہے کہ شہزادی کی شادی دیکھ کر جاؤ۔'' سچ کہوں میرا جی بھر بھرایا مگر سوچا کہ سیّدانی دیوانی ہوئی ہے؟ تو خاکی یہ آتشی زیادہ میل اچھا نہیں۔ ذرا سی دیر میں بگڑ بیٹھیں تو جلا کر خاک کر دیں۔ بھاڑ میں جائے پرستان اور پرستان کی شادی۔ چل

اپنے گھر چل اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: ''شہزادی کی شادی آپ کو جم جم نصیب ہو، مجھے تو جانے دیجیے۔'' یہ سن کر شہزادی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولی: ''سیّدانی بی، تم کیوں جاتی ہو؟ ہمارا دل کُڑھتا ہے، نہ جاؤ یہیں رہو۔'' میرے کلیجے پر چوٹ سی لگی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر بولی: ''سیّدانی تم پرواری، بیوی تم اپنا جی بھاری نہ کرو، تم بلاؤ گی تو سو دفعہ آؤں گی۔ ایکا ایکی دنیا نہیں چھوٹ سکتی۔ مٹّی مٹّی میں خوش رہتی ہے۔'' شہزادی تو کچھ خفا اور کچھ رونکھتی سی ہو کر اُٹھ گئی۔ بادشاہ بیگم بولیں: ''اچھّا بی سیّدانی، تمھاری مرضی۔ جاؤ خدا حافظ۔'' اور اسی کلموہے بکر گدھے کو حکم دیا کہ سیّدانی بی کو ان کے گھر پہنچا دے۔ ''خبردار! جو راستے میں کسی قسم کی شرارت کی اور دیکھو جو انعام واکرام سیّدانی بی کو بادشاہ نے دیا ہے، وہ سب پالکی میں رکھ لینا۔''

دل میں خوش اور ظاہر میں بسورتی ہوئی سب سے رخصت ہوئی۔ وہی پری زاد جو مجھے پالکی سے اتار کر لائی تھی، ساتھ لے کر چلی۔ پھاٹک کے باہر پالکی موجود تھی اور مردوں کی سی وضع کا آدمی پاس کھڑا تھا۔ مَیں پالکی میں بیٹھی اور دَم کے دَم میں پالکی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ پالکی میں بیٹھ کر مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ وہ جو پرستان کے بادشاہ نے انعام واکرام دیا ہے کہاں ہے، اندھیرے میں کیا نظر آتا۔ ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ ایک کونے میں بہت سے کنکر پتّھر معلوم ہوئے۔ جل گئی کہ موئے جنّات تھے نا، یہاں بھی دغا کیا۔ یہ ان کے گھر کا انعام اکرام ہے۔ خیر، جان بچی، لاکھوں پائے۔ خیریت سے گھر پہنچ جاؤں تو جانوں بڑا انعام پایا اور چپکے چپکے ایک ایک کر کے وہ کنکر اور پتھر پردے کی جھری میں سے پھینکنے شروع کر دیے۔ قاعدہ ہے کہ خوشی میں راستہ جلدی کٹ جاتا ہے۔ آنکھ بند کرتے میں گھر آ گیا۔ ڈیوڑھی میں پالکی رکھی گئی۔ چراغ جل رہا تھا۔ پردہ جو اُلٹا اور چراغ کی جوت جو پڑی تو کیا دیکھتی ہوں کہ جنھیں مَیں کنکر پتھر سمجھ رہی تھی، جواہرات ہیں۔ بڑے بڑے تو مَیں نے سب پھینک دیے تھے۔ دو چار ننھے ننھے سے باقی تھے۔ سر پیٹ لیا کہ اتنی دولت کھوئی۔ نگوڑی، پھینکنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسا ہی تھا، تو گھر آ کر پھینک دیتی، لیکن بہن! تقدیر کی کھوٹ کہاں جاتی ہے؟ نصیب میں تو پتھر بھی نہ تھے، ہیرے، لعل، زُمرّد کیوں ملتے؟ ایک ایک پیر من من بھر کا ہو گیا۔ صرف چار نگینے رہ گئے تھے۔ وہی لے کر بڑی مشکل سے اُتری۔ گھر میں جو پہنچی تو بونٹ پلاؤ جیسا چھوڑ گئی تھی ویسا ہی دم پر لگا ہوا تھا۔ بڑی بی، پکانے والی، مغرب کی نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔ دعا مانگ چکیں، تو اُنھوں نے پوچھا: ''بیگم کیا راستے میں سے اُلٹے پاؤں آ گئیں، خیر تو ہے؟'' مَیں نے دل میں کہا: لیجیے، یک نہ شُد دو شُد، پرستان میں خدا معلوم کتنے مہینے لگ گئے اور یہاں ابھی چاولوں کو دَم بھی نہیں آیا اور بڑی بی سے بولی: ''ہاں بی، بھوک لگی ہوئی تھی اور کچھ جی بھی ٹھیک نہ تھا۔ راستے ہی سے آ گئی۔ اب اِن شاء اللہ کل جاؤں گی۔''

(دہلی کی چند عجیب ہستیاں)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب تحریر کیجیے:

(الف) سیّدانی بی نے گزراوقات کے لیے کون سا پیشہ اختیار کیا؟

(ب) میر صاحب اور ان کی بیوی سیّدانی بی کی کس بات پر زیادہ خوش تھے؟

(ج) پرستان کے بادشاہ نے سیّدانی بی کو کس کام کے لیے بلوایا تھا؟

(د) بادشاہ بیگم کا اصلی نام کیا تھا؟

(ہ) پرستان کے پھلوں کی خاص بات کیا تھی؟

۲۔ سیّدانی بی نے پرستان کا تذکرہ دل چسپ انداز میں کیا ہے۔ آپ اپنے الفاظ میں اس کا خلاصہ لکھیے۔

۳۔ متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) سبق ''پرستان کی شہزادی'' کس مصنف کی تحریر ہے؟

(i) شاہد احمد دہلوی (ii) ہاجرہ مسرور

(iii) اشرف صبوحی (iv) سجاد حیدر یلدرم

(ب) قلعے کی بڑی بڑی مغلانیاں، سیّدانی بی کے سامنے:

(i) کام کرتی تھیں (ii) کھڑی رہتی تھیں

(iii) دم نہ مارتی تھیں (iv) کان پکڑتی تھیں

(ج) پرستان کے بادشاہ نے سیّدانی بی کو بلایا تھا:

(i) بیٹی کا جہیز ٹانکنے کو (ii) انعام دینے کو

(iii) بیٹی کو سینا پرونا سکھانے کو (iv) بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے

(د) سیّدانی بی کو کھانے میں مرغوب تھا:

(i) زردہ (ii) بونٹ پلاؤ

(iii) فیرنی (iv) بریانی

(ہ) پرستان میں پھل دار پودے بڑے تھے:

(i) بالشت بھر (ii) چھے فٹ

(iii) ایک ایک فٹ (iv) گز بھر

(و) پرستان سے سیدانی بی کو انعام میں کیا ملا؟

(i) روپیا پیسا (ii) کنکر پتھر

(iii) خلعت اور زیورات (iv) جواہرات

۴۔ مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کیجیے:

آنکھیں کُھلنا، بال بیکا ہونا، کلیجے پر سانپ لوٹنا، اوسان خطا ہونا، عقل جاتی رہنا

۵۔ کالم (الف) کا ربط کالم (ب) سے کریں:

کالم (الف)	کالم (ب)
مرہٹہ گردی	خوش مزاج
میر صاحب	جن
انڈا شہزادی	تباہی
بکر گدھا	دھاک
ہنر	کانڑا دیو

۶۔ سبق کے مطابق درست لفظ کے ذریعے سے خالی جگہ پُر کیجیے:

(الف) ایک وقت تھا کہ.....میں سیّدانی بی کا بڑا مقام تھا۔ (قلعہ، محل، دربار)

(ب) سیّدانی بی کو مغلانی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا کیوں کہ.....۔

(اس کے والدین فوت ہو گئے، تجارت میں خسارہ ہو گیا، وہ بیوہ ہو گئیں)

(ج) اس نے کہاروں سے کہا: ''کم بختو! منہ سے کچھ تو.....۔ (کہو، پھوٹو، بولو)

(د) پرستان میں اسے.....لے کر گیا۔ (جن، پری زاد، فرشتہ)

(ہ) بادشاہ نے اسے.....انعام میں دیے۔ (زیورات، جواہرات، ملبوسات)

ذُومعنی الفاظ:

ایسے الفاظ کا املا تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن ان کے دو معنی ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض اوقات لفظ ایک معنی میں مذکر جب کہ دوسرے معنوں میں مؤنث ہوتا ہے۔

۷۔ ذیل کے جملوں میں سے ذُومعنی الفاظ الگ کر کے ان کے معانی لکھیے:

(الف) بارشوں سے آئینے کی آب جاتی رہی۔

(ب) سوات میں کون سی کان ہے؟

(ج) بادشاہ بیگم کے حکم پر شہزادی کے کپڑوں کے لیے تھان پہ تھان آنے لگے۔

(د) حق بات کہنے کی پاداش میں وہ دار پر جھول گیا۔

(ہ) جہاں چاہ وہاں راہ۔

۸۔ درجِ ذیل الفاظ کے متضاد تحریر کیجیے:

لطیف، شب، خشک، جُفت، شیریں، نشیب، تِریاق

تشبیہ

علمِ بیان کی اصطلاح میں کسی چیز کو خاص وصف کی وجہ سے کسی دوسری چیز کی مانند قرار دینا تشبیہ کہلاتا ہے، جیسے:

۱۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہے۔

۲۔ صہیب شیر کی مانند دلیر ہے۔

اس میں دو باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

جب ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جائے تو دونوں میں کسی مشترک وصف کا پایا جانا ضروری ہے، دوسرا یہ کہ جس چیز سے تشبیہ دی جائے اس میں یہ خوبی یا وصف زیادہ ہو۔

تشبیہ کے پانچ ارکان ہیں:

۱۔ مشبہ: جس چیز کو دوسری چیز جیسا کہا جائے۔

۲۔ مشبہ بہ: جس چیز سے تشبیہ دی جائے۔

۳۔ وجہِ شبہ: وہ مشترک صفت جس کی وجہ سے ایک چیز کو دوسری چیز جیسا کہا جاتا ہے۔

۴۔ غرضِ تشبیہ: جس مقصد کے لیے تشبیہ دی جاتی ہے۔

۵۔ حرفِ تشبیہ: وہ الفاظ یا حروف جو تشبیہ دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً طرح، مانند، جیسا، جیسی، سا وغیرہ۔

اوپر دی گئی دو مثالوں کے ارکان اس طرح ہیں:

مشبہ	مشبہ بہ	وجہِ شبہ	غرضِ تشبیہ	حرفِ تشبیہ
پانی	برف	ٹھنڈک	ٹھنڈا پن ظاہر کرنا	طرح
صہیب	شیر	بہادری	بہادری کا اظہار	مانند

سرگرمیاں

۱۔ سیّدانی بی کا مختصر خاکہ لکھیں۔

۲۔ دس جملوں میں پرستان کی تصویر کشی کریں۔

۳۔ سیّدانی بی نے پرستان کے پھلوں کا ذکر کیا ہے، ان کی چند خوبیاں کاپی میں لکھیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کو داستان، ناول اور مختصر افسانے سے متعارف کرایا جائے۔

۲۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ مضمون ''پرستان کی شہزادی'' داستان ہے یا ناول، مختصر افسانہ ہے یا صنفِ نثر کی کوئی اور قسم ہے اور کیوں؟

۳۔ اشرف صبوحی کے سوانحی حالات، طرزِ تحریر اور ان کی کہانیوں اور خاکوں پر مشتمل کتب سے متعارف کرایا جائے۔